182

Edite

گرد کا لالہ

کیف احمد صدیقی

ناشر:۔ نمائندہ کتاب گھر شیخ سرائے سیتاپور (یو۔پی)

خاندانی نام ـــــــ احتشام علی صدیقی

قلمی نام ـــــــ کیف احمد صدیقی

ولدیت ـــــــ عبدالمنان صدیقی

تاریخ پیدائش ـــــــ ۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

جائے پیدائش ـــــــ سیتاپور

تعلیم ـــــــ ایم۔ اے (سال اول)

ـــــــ ادیب کامل جامعۂ اردو علیگڈھ

پیشہ ـــــــ معلم میونسپل انٹر کالج سیتاپور (یو۔پی)

جملہ حقوق ـــــــ بحقِ مصنّف

تاریخ طباعت ـــــــ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء

تعدادِ بارِ اوّل ـــــــ ایک ہزار

مطبع ـــــــ نامی پریس لکھنؤ

قیمت ـــــــ تین روپے

کاتب ـــــــ شوکت لکھنوی

بہ اہتمام ـــــــ قیصری خاتون رضوی

چند ضروری باتیں

"گرد کا درد" میرا پہلا شعری مجموعہ ہے اس میں گذشتہ دس بارہ برسوں کی نظموں اور غزلوں کا مختصر انتخاب ہے۔ اس انتخاب کی تقریباً ساری تخلیقات ہندوپاک کے معیاری ادبی جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ پاکستان کے نقوش، اوراق اور سیپ سے لیکر ہندوستان کے شب خون کتاب، صبا، شاعر اور تحریک وغیرہ تک اردو ادب کے رسائل کی جو تاریخ بنتی ہے وہ سبھی ارباب ذوق کے سامنے ہے میرا کلام بھی انھیں رسائل سے بکثرت گزرا ہے۔

دیگر شاعروں کیطرح میں بھی اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں فرسودہ قسم کی عشقیہ شاعری سے متاثر رہا اور چند برسوں کے اندر تقریباً دو سو غزلوں اور نظموں کا خالق بن گیا حالانکہ وہ سارا کلام ہندوپاک کے مختلف ادبی و نیم ادبی رسائل میں شائع ہو چکا ہے مگر اُسے میں نے اِس مجموعۂ میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ وہ کلام اُس وقت کا تخلیق کردہ ہے جبکہ میں صرف عوامی مشاعروں سے دادِ تحسین حاصل کرنا ہی شاعری کی معراج سمجھتا تھا۔

میرے خیال میں ردّ و قبول کا یہ ارتقائی عمل ہر تخلیقی کام کرنیوالے کو کرنا ہی پڑتا ہے اور جیسے جیسے ذہن میں پختگی اور فکر میں سنجیدگی آتی جاتی ہے اِس عمل میں اُسی قدر بے رحمی اور سفاکی کا عنصر بڑھتا جاتا ہے لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اُس دَور میں جو کچھ بھی میں نے کہا وہ سب کا سب نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اِس مجموعہ میں چند غزلیات ایسی بھی ملیں گی۔ جن پر قدیم عشقیہ شاعری کی چھاپ ہے لیکن یہ غزلیں پھر بھی نئی ہیں کیونکہ ان کا اسلوب آہنگ اور لہجہ نیا ہے۔

ویسے بھی نئی شاعری کے لئے موضوعِ عشق شجرِ ممنوعہ تو نہیں؟ عشق تو ایک ایسا لافانی جذبہ ہے جسکی اہمیت کسی دَور میں بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ہاں اس جذبہ کے استعمال اور پیرایۂ اظہار میں اپنے عہد کا مزاج ضرور دھڑکنا چاہیئے۔

عشق آج بھی ہوتا ہے۔ ہجر کا درد بھی وہی ہے اور وصل کے خوابوں میں کیف بھی وہی

لیکن عاشق رات کی شفٹ پر کارخانہ گیا ہوا ہے۔ معشوق کی زلف، عارض اور کمر بھی وہی ہے لیکن اسکی انگلیاں دس بجے سے چار بجے تک ٹائپ رائٹر پر تھرک رہی ہیں۔ محبوبہ سے پارک پر ملاقات تو ہو سکتی ہے لیکن تنہائیاں آج کے جمِ غفیر سے دور تو نہیں۔ سڑکوں بارکوں، سنیما ہالوں، چائے خانوں اور ریس کے میدانوں پر ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ ہے ہجر کا دردِ ہو یا وصل کا خواب ۔ تلاشِ معاش ہو کہ یادِ رفتگاں اِن میں سے کسی کو بھی ہم آج کی مشینی بے حِس، سرد، بے مہر اور بھاگتی دوڑتی چیختی چلاتی زندگی سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ آج کا مشغول و معروف انسان اِس قدر تھکا ہوا ہے کہ وہ عشق جیسے فرحت بخش جذبہ میں بھی ایک تھکن، ایک سستاپن، اور ایک کاروباری سرد مہری کا تجربہ کرتا ہے۔ معشوق ہو کہ بیوی، اپنے بچے ہوں کہ اپنا باپ۔ اپنے گھر کا آنگن ہو کہ کسی قہوہ خانہ کا ہال۔ ہم سب سے کٹے ہوئے ہیں۔ سب کے لئے کاروباری ہیں۔

ایسے عالم میں عشق کی وہ صورت نہیں رہی جو میرؔ و غالبؔ کے عہد میں تھی۔ نئے عشق کو جدید شاعری میں اُسی طرح آنا چاہیئے جس طرح آج ہم اُسے محسوس کرتے ہیں لیکن عشق تو ایک جذبہ ہے۔ نارنگی کی ایک پھانک ہے پوری نارنگی تو نہیں۔ شاعر کے سامنے تو پوری زندگی پھیلی پڑی ہے۔ وہ کسی جذبہ، کسی تجربہ اور کسی عمل سے بھی متاثر ہو سکتا ہے مگر قدیم شاعری کی طرح آج کی شاعری میں صِرف عشق ہی اہم موضوع نہیں ہو سکتا اِس دَور میں چند ایسے بھی مسائل اور موضوعات ہیں جو عشق سے بہت زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔

ذاتی طور پر میں یہاں ایک بات واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کبھی کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہا اور نہ میرا نظریۂ شاعری کسی مخصوص نظریۂ فن کا پابند رہا۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے گزرنے کے بعد جب سے میں نے سنجیدگی اور شعوری طور سے شعر کہنا شروع کیا ہمیشہ میری یہی کوشش رہی کہ میرے ہر شعر میں نیا لہجہ اور

نئی فکر ہو۔ میں ہر اُس شعر کو جدید شعر سمجھتا ہوں جس میں یا تو کوئی نئی بات کہی گئی ہو یا اظہارِ خیال میں ندرت ہو۔ کسی فرسودہ مضمون کو جدید تراکیب، اچھوتی تشبیہات نئے استعاروں اور نئی علامتوں کے ساتھ نظم کرنا بھی میں جدید شاعری سمجھتا ہوں مگر وہ اشعار زیادہ جدید کہلانے کے مستحق ہیں جن میں نئے معاشرہ کے مسائل کسی جدید پیرایۂ اظہار اور نئے انداز سے پیش کئے گئے ہوں۔ میرے نزدیک نئی شاعری کی یہی سب سے بڑی پہچان ہے۔

آج کا عہد ایک تہہ دار عہد ہے۔ اپنے معنی اور مطالب میں بہت زیادہ غیر واضح بھی۔ اسی لئے آج کی شاعری کا غیر واضح ہونا بھی یقینی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ ساری شاعری مہمل ہو کر رہ جائے۔ کم الفاظ میں بات کہنا آج کے پیچیدہ اور مصروف عہد کی ضرورت ہے لیکن یہ الفاظ اتنے کم یا زیادہ بھی نہ ہوں کہ وہ اپنی شناخت ہی کھو بیٹھیں۔

اچھی شاعری ذہنوں کو مہمیز کرتی ہے۔ ممکن ہے وہ انسان کے متحیّر ذہن میں اُٹھنے والے سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے، کوئی حل نہ پیش کر سکے لیکن اُس کے اندر معنی اور حُسن کا جو محشر چھُپا رہتا ہے وہ فکر کو طمانیت اور روح کو جولانی ضرور بخشتا ہے۔ ایسی شاعری سوالات کے جواب کی قوّت نہ رکھتے ہوئے بھی نئے سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ پیش کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتی ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ سوالات جو ہمیں متحیّر کر دیں ہماری فکر کو ہمیشہ سے عزیز ہیں بہ نسبت اُن سوالوں کے جن کے جوابات ہمیں حاصل ہو جائیں۔

آجکل چند شعراء اپنے کلام میں اتنا زیادہ ابہام پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اِن کا سارا کلام مہمل ہو کر رہ گیا ہے اور لطف تو یہ ہے کہ چند حضرات صرف اسی قسم کی بے معنی شاعری کو عہدِ حاضر کی عظیم شاعری منوانے کی بے سُود کوشش کر رہے ہیں۔ جب اِن سے ایسے کلام کی تشریح طلب کی جاتی ہے تو یہ لوگ

بہت دلچسپ جوابات دیتے ہیں۔ مثلاً "کہیں تاج محل کی بھی تشریح ہوتی ہے؟" دراصل اسی قسم کی مہمل شاعری کی وجہ سے کچھ لوگ پوری جدید شاعری کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ جدید شاعروں میں ایک ایسا بھی طبقہ ہے جو صرف صحت مند جدید شاعری کا قائل ہے میرے خیال میں اسی شاعری سے مستقبل کی عظیم شاعری کے امکانات روشن ہیں۔ صحت مند جدید شاعری کے ساتھ ساتھ جو مہمل گوئی کا رجحان فروغ پا رہا ہے وہ انتہائی خطرناک ہے اس سے جدید شاعری اور پورے اردو ادب کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

آخر میں ایک اور خطرناک بات کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ادھر شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی طرح جدید شاعری کو بھی کچھ لوگ چند بندھے ٹکے اصولوں میں قید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے حضرات سے جدید شاعروں، ناقدوں اور قارئین کو بہت ہی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ایک دن جدید شاعری کا بھی وہی انجام ہوگا جو ترقی پسند تحریک کا ہوا۔

کیف احمد صدیقی

نظمیں

شاعر اور ناقِد

دُنیا کے دیہات میں یارو
شاعر اک دہقاں ہوتا ہے
اپنے ذہن کی دھرتی میں جو
فصلِ شعر و سخن بوتا ہے

نظم و غزل کے پودوں میں وہ
رنگِ قوسِ قزح بھرتا ہے
فکر و تخیل کے کھیتوں میں
اشکوں کی بارش کرتا ہے

اور جب اشکوں کی بارش بھی
موقع پر دھوکا دیتی ہے
جلتے ہوئے سورج کی گرمی
پودوں کو جھُلسا دیتی ہے

تب شاعر دِل کی رگ رگ سے
اپنا لہو کھینچا کرتا ہے
یعنی جُوئے خوُن بہا کر
پودوں کو سینچا کرتا ہے

دیکھ کے یہ پودے، شاعر کو
کتنی خوشی حاصِل ہوتی ہے
لیکن فصلِ شعر و سخن جب
کٹنے کے قابل ہوتی ہے

تب یہ شعر و سخن کے ناقِد
فصل کو یوں کاٹا کرتے ہیں
جیسے کاغذ جان کے بچے
نوٹوں کو پھاڑا کرتے ہیں

فکر پارے

چاند جیسے کوئی شہزادۂ آوارہ خیال
چاندنی جیسے طوائف کی گھنی زُلف کا جال
کہکشاں جیسے نمائش ہو جواں جسموں کی
رات جیسے کسی چکلے کی حسیں شام وصال

جسم جیسے کسی وحشی کا دریدہ جامہ
رُوح جیسے کسی بے گھر کا بھٹکتا نامہ
موت جیسے کسی دیہات کی خاموش فضا
زندگی جیسے کسی شہر کا اک ہنگامہ

اُف یہ سہمی ہوئی راتیں یہ لرزتے ہوئے دِن
رُخ ماحول سے اُڑتا ہوا غازہ جیسے
کفنِ ماضی سے لپٹی ہوئی اِمروز کی لاش
وقت کے دوش پہ لمحوں کا جنازہ جیسے

اُف مِرے دِل میں تری یاد کی پُرخوف فضا
کوئی دوشیزہ کسی گھر میں اکیلی جیسے
ہائے یہ ذہن کا آسیب زدہ سنّاٹا
کسی جنگل کی پُراسرار حویلی جیسے

گرد کا درد

منزلِ عیش کے تجسّس میں
جب کبھی میں اپنے دامنِ دل سے
درد کی گرد
جھاڑ کر نکلا
مجھکو راہِ طلب کے سینے پر
حادثوں کے
ہزار زخم ملے
میرے ہر اک قدم کی آہٹ پر
راستے کے
ستم زدہ ذرّے
میرے پیروں کے آبلوں کی طرح
دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روئے
دیکھ کر
یہ اُداسیوں کا سماں
میں خود اپنے دُکھوں کو بھول گیا
اور گھبرا کے
اپنی سانسوں میں
گرد کے درد کو سمیٹ لیا

جینے کے سہارے

وہ پوشیدہ جلوے
جو میں تیسری آنکھ سے دیکھتا ہوں
وہ کارِ نمایاں
جو میں تیسرے ہاتھ سے کر رہا ہوں
وہ لمبی مسافت
جو میں تیسرے پیر سے ناپتا ہوں
وہ نازک مسائل
جو میں دوسرے ذہن سے سوچتا ہوں
وہ انجان جذبے
جو میں دوسرے دل سے پہچانتا ہوں
اُنھیں کے سہارے تو میں آج تک
اجنبی شہر میں جی رہا ہوں
اگر تیسری آنکھ، یہ تیسرا ہاتھ، یہ تیسرا پیر
یا دوسرے ذہن و دل
مجھکو حاصل نہ ہوتے
تو میں بھاگتی دوڑتی شاہراہوں کے پیچھے
خدا جانے کس موڑ پر
ایک پتھر کی مانند بے جان ہوتا

مجبوری

آج اِک لفظ کی موت پر
سارے الفاظ
کِس درجہ مغمُوم ہیں
اپنے اپنے مُعانی سے محرُوم ہیں
دُور تک
دشتِ تشبیہ و تمثیل میں
اِستعاروں کی تپتی ہوئی ریت پر
بے معانی کی
دہکی ہوئی دُھوپ ہے
میرے اشعار
ہر غیر واضح علامت کے سائے تلے
چند لمحات کی زندگی کے لئے
خود کو محفوظ کرنے پہ مجبُور ہیں

رات کے بارہ بجے

رات کے بارہ بجے ہیں
میری آنکھیں
ٹوٹتے خوابوں کی کچھ کرچیں سمیٹے
اپنی زخم آلود پلکوں پر
ہزاروں خون شدہ لمحات کی لاشیں اٹھائے
نیند کی اڑتی ہوئی پرچھائیوں کو
قید کرنے کی غرض سے
جاگتی ہیں
اور شاید
رات بھر جاگا کریں گی
آخرِ شب تک
مری زخمی نگاہوں سے لہو رستا رہے گا
صبح یہ سارا لہو
سورج کی تھالی میں چمک کر
دہر کی ہر چیز کو روشن کرے گا
اور مجھکو
موت کے تاریک غاروں میں
سسکتا چھوڑ دے گا

ضعیفِ وقت

ضعیفِ وقت
ہے بیمارِ کتنی صدیوں سے
کمر بھی خم ہے
نگاہوں سے سُوجھتا بھی نہیں
تھکن سے چُور ہیں اعضاء
لرز رہے ہیں قدم
نحیف جسم میں
تپتا ہے حادثوں کا بُخار
نفس نفس میں
جراثیم ہیں تنفس کے
ہوا کے ساز پہ
رہ رہ کے کھانستا ہے مگر
لرزتے ہاتھ سے
لمحات کا عصا ٹیکے
سُلگتی دُھوپ کی تپتی ہوئی رِدا اوڑھے
رواں ہے
دشتِ تجسس کے رہگزاروں میں

سوچ کا آتش کدہ

سوچتا ہوں
وقت کی گردن پکڑ کر
ریشمی اِسکارف کا پھندا لگا کر
کھینچ لوں
اور اتنی زور سے چیخوں
زمیں سے
آسماں تک
صرف میری چیخ ہی کا شور گونجے
وقت کی مرتی ہوئی آواز
کوئی سُن نہ پائے

سوچتا ہوں
وسعتِ آفاق میں پرواز کر کے
رات کی آنکھوں میں
تاریکی کا پردہ ڈال کر میں
چاند تاروں کو چُرا لاؤں زمیں پر
اور تھوڑی دیر
بچّوں کی طرح
خوش ہو کے کھیلوں

کھلونے سے بھی
جب اپنا دل نہ بہلے
ایک پتھر پر پٹخ کر
ہر کھلونے کو میں چکنا چُور کر دوں

سوچتا ہوں
آسماں سے چھین کر
جلتے ہوئے سُورج کی تھالی
ایک کشتی کی طرح
گہرے سمندر میں چلاؤں
اور اُس پر ساری دُنیا کو بٹھا کر
غرق کر دوں

سوچتا ہوں
سوچتے ہی سوچتے
میں خود ہی اک دِن
سوچ کے آتشکدہ میں جل نہ جاؤں

دلدل

میں دلدل میں پھنسا ہوا ہوں
میرے دونوں پیروں کو
پاتال سے کوئی کھینچ رہا ہے
میں جتنا ہی زور لگا کر
اوپر یا دلدل سے باہر
جانے کی کوشش کرتا ہوں
اتنا ہی میں
رفتہ رفتہ
اندر کو دھنستا جاتا ہوں
میری دونوں آنکھیں
نیلے آسمان کو تاک رہی ہیں

میری نظریں
آسمان سے پرے کہیں
سرگرمِ سفر ہیں

میرا ذہن
نہ جانے کن سیاروں میں گردش کرتا ہے
میرا تخیل
چاند کے ویرانے میں پناہیں کھوج رہا ہے

میرے بدن کی ساری قوّت
جانے کِن صحراؤں میں گم ہے
میری رگوں کے خوُن میں شاید برف جمی ہے
سارے اعضا، سرد پڑے ہیں
میری رُوح
جو کائنات پر
اپنے پر پھیلائے ہوئے تھی
آج بہت ہی سہمی سہمی
آنے والے اندیشہ سے خوف زدہ سی
اپنے اندر سمٹی سمٹی
اک موہُوم سا نقطہ بن کر
میرے لاغر جسم کے جانے کِس گوشے میں چھُپی ہوئی ہے
اور میں پیہم چیخ رہا ہوں
"کوئی بچاؤ، کوئی بچاؤ"
لوگ تماشہ دیکھ رہے ہیں
کِس کو فرصت؟
جو میری باہوں کو پکڑ کر
خود بھی دَلدَل میں پھنس جائے

سردیوں کی ایک رات

دسمبر کے آخر کا یہ سرد موسم
ٹھٹھرتی ہوئی یہ برہنہ ہوائیں
یہ کہرے کی چادریں
لپٹی ہوئی شب
میں اک گرم کیفے میں بیٹھا ہوا ہوں
مرے سامنے
چائے کی ایک پیالی
خدا جانے کس آگ میں جل رہی ہے
سُلگتے ہوئے
سگرٹوں کے کشوں سے
مری رُوح کے
برف زاروں میں جیسے
گناہوں کی دوزخ دہکنے لگی ہے

مرا ذہن
فِکروں کے شعلوں میں جل کر
خیالوں کا آتشکدہ بن گیا ہے
مگر دِل
خدا جانے کس سوچ میں منجمِد ہو رہا ہے

رات کا دِن

شام کا آفتاب
ڈھلتے ہی
میری آنکھوں سے نیند کا سُورج
مُسکرا کر طلوع ہوتا ہے
ذہن کے صحن میں خیالوں کی
تِبسمنی دھوپ پھیل جاتی ہے
اور جب نصف شب کی خنکی میں
سرد لمحات کی تمازت سے
رات کی دوپہر سُلگتی ہے
اپنی تعبیر ہی کے شعلوں سے
کاغذی خواب خاک ہوتے ہیں
رات بھر حسرتوں کے ٹیلے پر
خواب کی راکھ
جمع ہوتی ہے
جب پرندوں کی چہچہاہٹ سے
وقت کی بند آنکھ کھُلتی ہے
راکھ کے ڈھیر ہی سے پھر چھُپ کے
دِن کا سُورج طلوع ہوتا ہے

ناگن

جسم کے اندھے غار کے اندر
رُوح کی اک زہریلی ناگن
اپنا کالا پھن پھیلائے
سانسوں کی ہر اک آہٹ پر جُھوم رہی ہے
دل کے دھڑکنے کی آوازیں
غار کے گہرے سناٹے میں
بین کا نغمہ چھیڑ رہی ہیں
صبح ازل سے شام ابد تک
رُوح کی یہ زہریلی ناگن
میرے لہُو کا قطرہ قطرہ
اپنی خشک زباں سے پی کر
عیش و طرب میں مست رہے گی
اک دن ایسا بھی آئے گا
میرے بدن کی ساری رگوں میں
زہر ہی زہر بکھر جائے گا
یہ نادان پیاسی ناگن
زہر کو تازہ خوُن سمجھ کر پی جائے گی
اور قضا کا ہاتھ پکڑ کر جسم سے باہر آ جائے گی

اُمید و بیم

زندگی
اک برگ آوارہ کی صورت
حادثوں کی گرد اُڑاتی آندھیوں میں
خواہشوں کی ریشمی چادر میں لپٹی
وقت کے ہر پیچ و خم کا جائزہ لیتی ہوئی
کیا جانے کس جانب رواں ہے

اور میں
گرتی ہوئی تہذیب کی دیوار کا لیکر سہارا
خوابِ مستقبل کے صحرا میں
کھڑا ہوں
سوچتا ہوں
جانے کتنی دیر میں طوفان ٹھہرے
جانے کب؟
ٹوٹے یہ کالی شب کا جادو
کیا خبر؟
فردا کا سورج جگمگا کر
میرے احساسات کو روشن کرے گا
یا نظر کی روشنی بھی چھین لے گا

مُجرم

اکثر رات کے سناٹے میں
میں اپنے بستر پر لیٹا
گھنٹوں سوچا کرتا ہوں
نیند نے
کوئی جُرم کیا ہے
جسکی سزا کے خوف سے اب تک
دُنیا کی نظروں سے چھُپ کر
رات کی گہری تاریکی میں
ماری ماری پھرتی ہے
اور کبھی
جب انجانے میں
میری آنکھوں کے زنداں میں
دھوکا کھا کر آ جاتی ہے
تھوڑی دیر کی قیدی بن کر
چوری چوری
صبح سے پہلے
پلکوں کی چلمن سے نکل کر
جانے کہاں پھر کھو جاتی ہے

مشورہ

میں نے مانا
"پپّو" سے اک چائے کی پیالی
ٹُوٹ گئی ہے
اتنی چھوٹی بات پہ اُس کو
غصّے سے کیوں پیٹ رہی ہو
"پپّو" تو بچّہ ہے لیکن
اِس دُنیا میں
جانے کتنے دانشور انسانوں نے بھی
انجانے میں
وقت کے پتّھر سے ٹکرا کر
اپنی قسمت کے آئینے
توڑ لئے ہیں

گمراہی

میں بھی
اپنے عہد کا دَدِھیچ ہوں
میں بھی
اپنی سانس اُوپر کھینچ کر
دیوتاؤں کے تحفظ کے لئے
جسم کو بے رُوح کر سکتا ہوں
تھوڑی دیر میں
اور میری ہڈیوں سے
لوگ ظالم راکھشس کی جان لے کر
دیوتاؤں کو
سکوں کی نیند دے سکتے ہیں
لیکن
آج کے ایٹم پرست انسان کو تو
اپنی طاقت سے زیادہ
ایٹمی قوّت پہ ہے کافی بھروسہ

تپسیا

دورِ حاضر کی
ہر غمزدہ زندگی
درد و غم کی
سُلگتی ہوئی دُھوپ میں
فِکر و احساس کے
آشرم میں چھُپی
اپنی خلوت کے جنگل میں
بیٹھی ہوئی
اِک رِشی کی طرح
جانے کِس کی تپسیا میں
مصروف ہے

خود غرضی

گھر کی کشادہ انگنائی میں
اک ڈلیا کے اندر چاول
دُھوپ میں رکھے
سُوکھ رہے ہیں
چاول کے ہر دانے کو
سُورج کی کرنیں چاٹ رہی ہیں
دُھوپ کی شدّت
چاول کے اندر کی نم آلود حرارت
چُوس رہی ہے
آنگن کی دیواروں پر
کچھ بھُوکی چڑیاں
چاول کے ہر دانے کو
للچائی نظر سے دیکھ رہی ہیں
کبھی کبھی
وہ ہمّت کر کے
ڈلیا کے بھی پاس آتی ہیں

لیکن تھوڑی دُور پہ بیٹھی
گھروالی کے خوف سے
فوراً اُڑ جاتی ہیں
گھروالی کے ہاتھ میں اِک لمبی سی چھڑی ہے
لیکن اُس کے دِل میں
اپنی بھُوک کے آگے
اِن چڑیوں کی بھُوک کا کچھ احساس نہیں ہے
دُھوپ میں چاول
سُوکھ رہے ہیں
چاول کے ہر دانے کو
سُورج کی کرنیں چاٹ رہی ہیں

شکستِ غرور

ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی
سطحِ سیلِ رواں پر تھی محوِ سفر
رات کا وقت تھا
سامنے اِک چمکتا ہوا شہر تھا
یک بیک ایک پُختہ عمارت
بصد ناز
وہ خستہ و زار سی
جھونپڑی دیکھ کر
طنزیہ طور پر مُسکرانے لگی
اپنی تقدیر پر رشک کرنے لگی
ناگہاں
ایک بپھرے ہُوئے تیز طُوفان نے
اُس عمارت کو بھی
اپنی آغوش میں لے لیا
اور پانی کے اندر ہی دفنا دیا
جھونپڑی سطحِ سیلاب پر
تیرتی ہی رہی

نیا سفر

یخ زدہ سوچ کی چادر میں
یہ لپٹی ہوئی شام
شدتِ گرمیٔ پرواز سے
جلتے ہوئے جبریلِ شب ماہ کے پر
چاند کی دھوپ میں
اُڑتا ہوا ماحول کا رنگ
چاندنی رات کے ہونٹوں پہ
سسکتے ہوئے ماضی کے حروف

چاند کے گرد
سُلگتا ہوا راکٹ کا دھواں
وقت کی سانس میں
تحلیل ہوا جاتا ہے
اور میں خود سے بہت دور خلاؤں سے پرے
نسب کرتا ہوا
مستقبلِ زرّیں کے نشاں
جانے کس وادیٔ گمنام کی جانب ہوں رواں

سُورج کی آنکھ

سُورج کی آنکھ
آج مری خوابِ گاہ میں
کیا جانے کس دراز سے دَر آئی

اور میں
بستر پہ بے لباس و برہنہ پڑا ہُوا
خوابوں کے پیرہن کے لئے بیقرار تھا
سُورج کی آنکھ
گرم نگاہوں سے دیر تک
غیض و غضب سے میری طرف گھورتی رہی

میرے برہنہ جسم میں
اِک کپکپی ہُوئی
میں نے نظر اُٹھائی تو بستر کے پاس ہی
میرا لباس
خُون میں ڈوبا ہُوا مِلا
گھبرا کے زور زور سے میں چیخنے لگا
اور اپنی خواب گاہ سے باہر نکل گیا
سُورج کی آنکھ
میری طرف بھاگتی رہی

میں اپنے ساتھ
خوف کے سائے سمیٹ کر
ویران جنگلوں کی طرف دوڑتا رہا
لیکن کہیں پناہ کا سایہ نہیں ملا
آخر میں ایک برف کی چوٹی سے پھاند کر
دن کے سیاہ دشت میں
تحلیل ہو گیا
سورج کی آنچ
میرے تعاقب میں آخرش
مایوسیوں کے گہرے اندھیرے میں کھو گئی
کچھ دیر تک
میں برف زدہ خون کی طرح
ماحول کی رگوں میں تڑپتا رہا مگر
ڈھلتے ہی دن کے سائے
میں تاروں کی چھاؤں میں
پھر اپنی اصلی شکل میں تبدیل ہو گیا

دائروں کا دشت

رات کے اندھے کنوئیں میں
خواب
پانی بھر رہے ہیں
پیاس کا بے آب دریا
ریگزارِ خامشی پر
چاندنی کی دُھوپ میں لہرا رہا ہے
نیند کا بے خواب نشّہ
وقت کی بیدار آنکھوں میں پگھل کر
برف بنتا جا رہا ہے
ساتویں جنگل کی آسیبی حویلی سے نکل کر
ریل کی سیٹی
اُفق کے پار
جانے کِس سمندر کو صدائیں دے رہی ہے
پٹریوں پر
خوں شدہ لمحات کی لاشیں پڑی ہیں

خامشی منھ پیٹتی
تاریکیوں میں سر برہنہ پھر رہی ہے
چاند کی زخمی رگوں میں
آفتابی زہر گھلتا جا رہا ہے
اور ہر انسان
اپنے دائروں کے دشت میں
خود ہی سمٹ کر
ریت کی مانند
بکھرا جا رہا ہے

میرے کمرے کی ایک رات

مرے کمرے کی دیواروں پہ
کچھ لاشیں ٹنگی ہیں
مسہری کے سرہانے میز پر
بکھری ہوئی ٹوٹی کتابیں
کانپتے الفاظ کے منھ نوچتی ہیں

فرش پر
ٹوٹے ہوئے کچھ کانچ کے برتن پڑے ہیں
اور الماری پہ رکھے
ریڈیو کی گونجتی آواز بھی بھرا رہی ہے
چند سائے
کرسیوں کی آڑ سے
کیا جانے کس آسیب کا منھ تک رہے ہیں
اور میں بستر میں سمٹا دم بخود
کیا جانے
کیسی ساعتوں کا منتظر ہوں

رُوحانی سفر

میرے بدن میں
نہ جانے کب سے
ہزار ہا زخم زخم سائے
رگوں کے جلتے ہُوئے لہُو میں
تڑپ تڑپ کر
سُلگ رہے ہیں
ہر ایک سائے کے زخم میں
زندگی کا سوُرج دہک رہا ہے
مگر مری رُوح
موت کا سرد ہاتھ تھامے
قدم قدم
دشتِ تشنگی میں
صد آفتابوں کی دُھوپ پی کر
نہ جانے
کس برف زارِ آتش زدہ کی جانب
رواں دواں ہے

مٹّی

یہ میرے جسم کی مٹّی
نہ جانے کتنی صدیوں سے
مرے اجداد کے ویران جسموں میں سفر کرتی
ہوائے وقت سے اُڑتی
مرے دشتِ بدن میں
ریت کی مانند بکھری ہے
یہی بے رنگ سی مٹّی
لہو میں
ڈوب کر اکثر
بکھر جاتی ہے آنکھوں سے
تو لاکھوں رنگ
سطحِ زندگی پر پھیل جاتے ہیں

غزلیں

بياض

○

گھبرا کے شہرِ نو کی مشینوں کے شور سے
میں خود کو دے رہا ہوں صدا زور زور سے

سُوکھے ہوئے درخت میں سویا ہُوا تھا دن
سُورج کی آنکھ کھُل گئی پتّوں کے شور سے

یہ کِس کی رُوح اپنے بدن میں سمیٹ کر
نِکلا ہے چاند رات کی تاریک گور سے

میری حیات غم کی وہ بھاری چٹان ہے
جِسکو اُٹھا رہا ہوں میں ریشم کی ڈور سے

کالی گھٹائیں ہیں کہ سُلگتا ہُوا دھواں
یہ بات پوچھئے کِسی جنگل کے مور سے

میں دشتِ ماہتاب کو سیراب کر گیا
کچھ پیاس لے کے وقت کے پیاسے چکور سے

مُمکن ہے کوئی لُوٹ لے اندازِ فکر بھی
اے کیفؔ ہوشیار رہو فن کے چور سے

○

کوئی درخت ہے نہ ہَوا ہے نہ آب ہے
ویران میرے دِل کی طرح ماہتاب ہے

دریا کی موج ہی میں نہیں اضطراب ہے
سنگِ رَواں کے دِل میں بھی اِک زخمِ آب ہے

وہ خود ہی اپنی آگ میں جَل کر فنا ہوا
جِس سائے کی تلاش میں یہ آفتاب ہے

ہر فرد آج ٹوٹتے لمحوں کے شور میں
عصرِ رَواں کی جاگتی آنکھوں کا خواب ہے

اب کوئی نِصف دام پہ بھی پُوچھتا نہیں
یہ زندگی نصاب سے خارج کتاب ہے

پلکوں پہ آج نیند کی کرچیں بکھر گئیں
شیشے کی آنکھ میں کوئی پتھّر کا خواب ہے

اے کیفؔ ناقدوں کے تعصّب کے باوجُود
میرا ہر ایک شعر ادب کی کتاب ہے

○

اک سانپ مجھ کو چوم کے تریاق دے گیا
لیکن وہ اپنے ساتھ مرا زہر لے گیا

دُنیا کا ہر لباس پہننا پڑا اُسے
اک شخص جب نکل کے مرے جسم سے گیا

اکثر بدن کی قید سے آزاد ہو کے بھی
اپنا ہی عکس دُور سے میں دیکھنے گیا

ایسی جگہ کہ موت بھی ڈر جائے دیکھ کر
میں خود کو زندگی سے بہت دُور لے گیا

محسوس ہو رہا ہے کہ میں خود سفر میں ہوں
جس دن سے ریل پر میں تجھے چھوڑنے گیا

کتنی شبک سی آج مرے گھر کی شام تھی
میں فائلوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے گیا

اشعار کا نزول ہے خالی دماغ میں
اے کیفؔ تو نہ جانے کہاں سوچنے گیا

نِکلی جو آج تک نہ کسی کی زبان سے
ٹکرا رہی ہے بات وہی میرے کان سے

کل رات مجھ کو شہرِ طلسماتِ خواب میں
چِپکی ہوئی زمین ملی آسمان سے

سوتا رہا میں خوف کی چادر لپیٹ کر
آسیب چیختے رہے خالی مکان سے

اکثر میں ایک زہر بُجھے تیر کی طرح
نِکلا ہوں حادثات کی تِرچھی کمان سے

پَھیلا ہوا ہے حدِ نظر تک سکوتِ مرگ
آواز دے رہا ہے کوئی آسمان سے

تنہائیوں کو سونپ گئے تاریکیوں کا زہر
راتوں کو بھاگ آئے ہم اپنے مکان سے

○

اے سر پھری ہوا ذرا آہستگی سے چل
تھکنے لگا ہے وقت کا پنچھی اُڑان سے

تا ماہتاب پیکرِ خاکی کو بھیج کر
آنکھیں مِلا رہی ہے زمیں آسمان سے

اب جنس کے بجائے اگر جیب گرم ہے
جا کر خرید لاؤ گرانی دُکان سے

ممکن ہے خوب کھُل کے ہو گفت و شنید آج
وہ بھی خفا ہے ہم بھی ہیں کچھ بدگمان سے

کیا کیا حسین خواب ڈھلے برف کی طرح
مایوس زندگی کی سُلگتی چٹان سے

اے کیفؔ جن کو بغض نئی شاعری سے ہے
وہ بھی ترے کلام کو پڑھتے ہیں دھیان سے

کہتی ہیں قلبِ وقت کی بیتاب دھڑکنیں
چھیڑو نہ کائنات کی دُکھتی ہوئی رگیں

دیہات کی حسین فضا بھی بدل نہ دیں
یہ شہرِ نو کی زہر اُگلتی ہوئی ملیں

سارا لہو نچوڑ لیا جسم سے مگر
اب بھی کسی کے خون کی پیاسی ہیں فائلیں

اکثر مرے مزارِ دلِ نامراد پر
راتوں کو تیری یاد چڑھاتی ہے چادریں

یوں گردِ غم میں گم ہیں اُمیدوں کے قافلے
جیسے غبارِ راہ میں کھوئی ہوئی بسیں

اشکوں کی بھیک مانگ کے عصرِ جدید سے
شاداب کر رہا ہوں میں تہذیب کی جڑیں

جیسے کسی کی حرکتِ دل بند ہو گئی
یوں آج موجِ فکر کی ساکت ہیں جنبشیں

دن بھر غمِ معاش میں جلتا رہا لہو
اب کیا تھکے دماغ سے فکرِ سخن کریں

اے کیفؔ تیرے ذہن میں اشعار کا نزول
کافر کے گھر میں جیسے ہوں رحمت کی بارشیں

○

یہ جھوٹ ہے کہ تم سے محبت نہیں مجھے
لیکن غمِ معاش سے فرصت نہیں مجھے

میں ہوں مشینی دَور کا مصرُوف آدمی
خود سے بھی بات کرنے کی مہلت نہیں مجھے

یہ زندگی ہے صبح کے اخبار کی طرح
دِن بھر کے بعد جس کی ضرورت نہیں مجھے

جب سے نصیب ہو گئی بجلی کی روشنی
گھر کے چراغ سے بھی محبت نہیں مجھے

کل ایک شخص کار سے ٹکرا کے مَر گیا
یہ حادثہ بھی باعثِ حیرت نہیں مجھے

اَے ریڈیو! سنبھل کے سُنا میرؔ کی غزل
کمزور دِل ہوں تابِ سماعت نہیں مجھے

میں کیفؔ عصرِ نَو کا پرستار ہوں مگر
ماضی کی خوبیوں سے بھی نفرت نہیں مجھے

تا حدودِ نگاہ روشن ہے شہر بجلی کے قمقموں سے مگر
قلب کا بلب بُجھ گیا جب سے روشنی کو ترس رہی ہے نظر

وقتِ رحلت کچھ اِس طرح دل میں کروٹیں لے رہی ہے آتشِ غم
ہونٹ میں کچھ جلن سی ہو محسوس جیسے سگرٹ کے آخری کش پر

یہ زمانے کی سرد سرد ہوا داخلِ جسم ہو ہی جائے گی
کیجیئے لاکھ سوٹ زیبِ بدن، باندھیئے لاکھ کان میں مفلر

ہر طرف شہرِ نَو کے ہنگامے، ہر طرف شور کارخانوں کا
تجھ کو اے دشتِ دل کی ویرانی سوچتا ہوں میں لیکے جاوں کدھر

اس طرح گامزن ہے دُنیا میں تیز رفتار کاروانِ حیات
جس طرح رات کے اندھیرے میں ایک جنگل سے راہرو کا گذر

یوں زمانے کے دشت میں ہم نے زندگی کی مُسافتیں طے کیں
جیسے اک تشنہ لب مُسافر کا ریگزاروں میں سائیکل سے سفر

کیف میں کائنات میں ابتک ایک تیرہ نصیب ہوں لیکن
میرے خونِ جگر سے دُنیا میں جل رہے ہیں چراغِ فکر و نظر

جو صدا گونجتی تھی کانوں میں — منجمد ہو گئی زبانوں میں

کتنے لوگوں کو ہو گئی ٹی۔بی — شہر کے دِق زدہ مکانوں میں

لمحہ لمحہ پگھل رہی ہے حیات — خواب کی یخ زدہ چٹانوں میں

کِتنے جذبات ہو گئے آہن — اِن مشینوں کے کارخانوں میں

شہد کا گھونٹ بن گیا ہوگا — ذائقہ زہر کا زبانوں میں

کِتنی صدیوں کے بوجھ کی ہے تھکن — زندگی کے نحیف شانوں میں

خامشی بھوت بن کے رہتی ہے — آج انسان کے مکانوں میں

جِسم مفلوج ہو گیا ہے مگر — خواہشیں رینگتی ہیں رانوں میں

فلسفہ ہے اسیر نظم و غزل — فکر محبوس ہے فسانوں میں

اِک حسیں پھول بن کے گِرتی ہے — برق بھی میرے آشیانوں میں

فن کو نیلام کر دیا آخر
کیفؔ لوگوں نے چند آنوں میں

وقت لاکھوں حادثاتِ ناگہاں لکھتا رہا
پھر بھی دل کی ڈائری کا ہر ورق سادہ رہا

رات میرے ذہن میں کیا جانے کیا اُلجھن رہی
دیر تک میں سگریٹوں پر سگریٹیں پیتا رہا

مرگِ دل مرگِ محبّت اور مرگِ آرزو
اتنی موتیں دیکھ کر میں کس طرح زندہ رہا

آفتابِ زندگی کی چلچلاتی دُھوپ میں
میں برہنہ پا تلاشِ مرگ میں پھرتا رہا

اِک محل کی چاندنی بیتاب تھی میرے لئے
میں اندھیری رات میں فٹ پاتھ پر لیٹا رہا

سب نے تو تعمیر کر ڈالے حقیقت کے محل
اور میں خوابوں کی اک دیوار ہی چُنتا رہا

کیفؔ یہ فکرِ سخن وہ جان لیوا شوق ہے
قطرہ قطرہ خونِ دل پی کر بھی جو پیاسا رہا

○

چاند کی برف زدہ لاش گلی جاتی ہے
چاندنی آگ کے پیکر میں ڈھلی جاتی ہے

نیند بھی آج خیالوں کے کفن میں لپٹی
خواب کے شہرِ خموشاں میں چلی جاتی ہے

رات کو جسم کے زنداں سے نکل کر پہروں
جانے کس سمت مری رُوح چلی جاتی ہے

زندگی ایک سُلگتے ہوئے کاغذ کی طرح
آتشِ وقت کے شعلوں میں جلی جاتی ہے

اپنے آنچل کو بنائے ہوئے سورج کا کفن
چھاؤں بھی دُھوپ کے ہمراہ ڈھلی جاتی ہے

آج ہر جسمِ بشر ہے کسی سادھو کا بدن
جس پہ گردِ غم و افکار ملی جاتی ہے

واقعی کیفؔ ترے کرب زدہ شعروں میں
آج کے عہد کی آواز ڈھلی جاتی ہے

سارے دِن دشتِ تجسّس میں بھٹک کر سو گیا
شام کی آغوش میں سُورج بھی تھک کر سو گیا

آخرِ شب میں بھی کھا کر خواب آور گولیاں
چند لمحے نشّۂ غم سے بہک کر سو گیا

یہ سکوتِ شام، یہ ہنگامۂ ذہنِ بشر
رُوح ہے بیدار لیکن جسم تھک کر سو گیا

آخرش اِس دورِ پُر آشوب کا ہر آدمی
خوابِ مستقبل کے جنگل میں بھٹک کر سو گیا

زندگی بھر اب اندھیری رات میں ہے جاگنا
اب تو قسمت کا ستارہ بھی چمک کر سو گیا

آخرش سارے چمن کو دے گیے حُسنِ زندگی
موت کے بستر پہ ہر غنچہ مہک کر سو گیا

چند دِن گلشن میں نغماتِ مسّرت چھیڑ کر
شاخِ غم پر رُوح کا پنچھی چہک کر سو گیا

پیکرِ الفاظ میں اک آگ دہکاتا ہوا
کاغذی صحرا میں اک شعلہ بھڑک کر سو گیا

کیفؔ یوں آغوشِ فن میں ذہن کو نیند آگئی
جیسے ماں کی گود میں بچّہ سِسک کر سو گیا

○

یہ رات جیسے کوئی معبدِ شکستہ ہے
یہ چاند جیسے کسی دیوتا کا لاشہ ہے

یہ کائنات مری ذات پر ہے اِک تہمت
یہ زندگی مرے دامن پہ ایک دھبّہ ہے

میں آفتاب ہوں سائے سمیٹتا ہوں مگر
اُسی کو پا نہ سکا جو کہ اپنا سایہ ہے

نہ جانے کتنی ہی صدیاں گذر چُکیں لیکن
صلیبِ وقت پہ مصلوب ایک لمحہ ہے

سِسک رہی ہے کوئی لاش قبرِ ماضی میں
یہ تیری یاد کہ میری حیاتِ رفتہ ہے

ہر ایک سمت سمندر ہے تیری رحمت کا
میرا وجُود گناہوں کا اک جزیرہ ہے

تری غزل سے برستی ہے کیف رحمتِ فن
تری غزل ہے کہ معبودِ شعر و نغمہ ہے

○

عہدِ ماضی کے سُلگتے لمحو

بحرِ حالات کی موجوں میں بہو

گونج اُٹھیں گے ہزاروں نغمے

دشتِ الفاظ میں آواز تو دو

ذہن ماؤف نہ ہو جائے کہیں

فلسفی بن کے نہ اتنا سوچو

گو دھیلائے ہوئے ہے دُنیا

اپنے کمرے سے تو باہر نکلو

آؤ باغیچۂ فردا میں چلیں

سنگِ ماضی سے نہ یوں سر پھوڑو

زندگی ڈھونڈھ رہی ہے محفل

یوں نہ تنہائی میں گھُٹ گھُٹ کے مرو

کتنی جاں بخش ہے دُنیا کی ہوا

اپنے احساس کے در باز کرو

خود یہ بھی آنچ نہ آنے پائے

وقت کی آگ میں جلتے بھی رہو

بستر خواب پہ بن جاؤ شکن
اِس طرح نیند میں کروٹ بدلو
درد کی آنکھ نہ کھُل جائے کہیں
یوں پکارو کوئی آواز نہ ہو
میں جو خود سے ہوں بہت دُور تو کیا
کم سے کم تم تو مرے پاس رہو
داستاں گوئی کا اب وقت نہیں
اِستعاروں میں ہر اک بات کہو
دِل اگر صاف نہیں، کچھ بھی نہیں
لاکھ شفّاف سے کپڑے پہنو
صرف پڑھنے سے نہیں کچھ حاصل
شعر کہنا ہے تو دُنیا دیکھو
اس بدلتی ہوئی دُنیا کے لئے
رنگ گِرگٹ سے بدلنا سیکھو
جس میں اے کیفؔ نہ ہو ندرتِ فن
اِس طرح کا نہ کوئی شعر کہو

جو دوسروں کے لئے جگمگائے جاتے ہیں
خود اُن کے دِل میں اندھیرے ہی پائے جاتے ہیں

چراغِ صبح کی مانند ساری محفل پر
بُجھے بھی ہم تو دُھواں بنکے چھائے جاتے ہیں

ہم ایک ڈھلتی ہوئی دُھوپ کے تعاقب میں
ہیں تیز گام مگر سائے سائے جاتے ہیں

چمن میں شدّتِ دردِ نمود سے غنچے
تڑپ رہے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں

ہیں وہ خزاں کا برہنہ بدن شجر ہوں جیسے
لباسِ زخم بہاراں پنہائے جاتے ہیں

شفق کی جھیل میں جب بھی ہے ڈوبتا سُورج
تو پاس دھوپ ہی جاتی نہ سائے جاتے ہیں

یہ زندگی وہ تڑپتی غزل ہے کیفِ جسے
ہر ایک سازِ حوادث پہ گائے جاتے ہیں

نفس نفس میں غمِ روزگار ہو جیسے
یہ زندگی کسی مُفلس کا پیار ہو جیسے

میں ایک لمحۂ نازک ہوں عصرِ نَو کا مگر
مری حیات پہ صدیوں کا بار ہو جیسے

مرے وجود میں ہے زندگی کا زہر بھرا
یہ جسمِ رُوح کی ناگن کا غار ہو جیسے

میں قیدِ جسم سے نِکلا تو یہ ہُوا محسوس
ہر ایک سِمت مرا انتظار ہو جیسے

ورق ورق پہ لکھے حادثات کے قصّے
یہ وقت بھی کوئی ناول نگار ہو جیسے

کسی نے سرسری نظروں سے پڑھ کے پھینک دیا
مِری حیات بھی اِک اشتہار ہو جیسے

جنابِ کیفؔ حقیقت میں آپ کی یہ غزل
ہر اہلِ فن کے لیئے شاہکار ہو جیسے

خامشی کی آگ میں جلتا ہوں میں
کاغذی آواز کا صحرا ہوں میں

خلوتوں میں مثلِ ہنگامہ ہوں میں
محفلوں میں ایک سنّاٹا ہوں میں

جیسے سُورج گُم ہو مُشتِ خاک میں
یوں غبارِ راہ کھویا ہوا ہوں میں

اے ہوائے سرد آہستہ گزر
راکھ میں سویا ہوا شعلہ ہوں میں

جس کی شاخوں میں ہے اک امرت بھرا
ہاں وہی اک زہر کا پودا ہوں میں

فصلِ گُل بھی مجھ پہ نازاں تھی مگر
آج اک سُوکھا ہوا پتّہ ہوں میں

مُنجمد لمحات پگھلاتا ہوا
فطرتاً اک آگ کا دریا ہوں میں

ہر سماعت جس کو چھُو سکتی نہیں
وہ سکُوتِ ساز کا نغمہ ہوں میں

آسمانی سرحدوں سے بھی پرے
جانے کس صحرا کا سنّاٹا ہوں میں

کیفؔ فن کے نیم گورستان میں
کیا خبر زندہ ہوں یا مُردہ ہوں میں

اللہ رے یہ میرے اشعار کی تنہائی
ہنگامۂ دُنیا میں فن کار کی تنہائی

تا حدِّ نظر جیسے اک موت کا سنّاٹا
یہ خلوتِ غم ہے یا بیمار کی تنہائی

اکثر تری یادوں کی سُنسان حویلی میں
ناگن سی نظر آئی دیوار کی تنہائی

اے موجِ صبا مجھ کو محسوس ہوئی اکثر
ہر انجمنِ گُل میں گلزار کی تنہائی

پھر بزمِ جنوں میں اک منصور کی حاجت ہے
آواز لگاتی ہے پھر دار کی تنہائی

بڑھتا ہی گیا شہرِ تنقید کا ہنگامہ
سمجھا نہ کوئی میرے اشعار کی تنہائی

اے کیفؔ نہ یوں گھومو تخلیق کے صحرا میں
ڈس لے نہ کہیں تم کو افکار کی تنہائی

○

مجھے نصیب ہوا تھا جو تیرے گاؤں میں
وہ لُطفِ خاص کہاں شہر کی فضاؤں میں

نہ جانے کون سے صحرا میں جا کے خاک ہُوا
میرا وجود سُلگتی ہوئی ہواؤں میں

شفق کی جھیل میں یہ کس کی لاش غرق ہُوئی
تمام سائے پگھلنے لگے فضاؤں میں

یہ سطحِ ماہ پہ ناپاک آدمی کے قدم
یہ رُوحِ عصر سِسکتی ہوئی خلاؤں میں

یہ آسماں کی طرف بھاگتے ہوئے سائے
یہ چیختی ہوئی رُوحیں قریب گاؤں میں

میں اب بھی وہم کی دیوار توڑ سکتا ہوں
ہے احتیاط کی زنجیر میرے پاؤں میں

تمام رات تڑپتی رہی وہ رقاصہ
خود اپنی زہر بھری ٹوٹتی اداؤں میں
عروسِ وقت کی سانسوں میں آگ بھڑکا کر
مری حیات پگھلتی رہی ہواؤں میں
میں اپنی رُوح کی آواز سُن سکا نہ کبھی
ہر ایک سمت بکھرتی ہوئی صداؤں میں
نہ جانے کتنے ہی انسان تلاشِ خود کیلئے
بھٹک کے رہ گئے تہذیب کی گھپاؤں میں
مرے دماغ کو اکثر بہت سکون ملا
تفکرات کی سمٹی ہوئی رداؤں میں
نہ جانے شہر کی سڑکوں نے کیا کیا جادو
کہ نرم گھاس بھی چُبھتی ہے میرے پاؤں میں
جناب کیف بھی کھوئے ہوئے نظر آئے
نگارِ شعر و سخن کی حسیں اداؤں میں

○

ہائے یہ رات کا آسیب زدہ سنّاٹا
اپنی آواز سے خود کانپ اُٹھا سنّاٹا

دشتِ تنہائی کو دوزخ کیطرح دہکاکر
ایک سُورج کی طرح ڈُوب گیا سنّاٹا

بارہا اپنی ہی آواز سے ٹھوکر کھاکر
دل کی تنہائی کے غاروں میں گرا سنّاٹا

پہلے اِک موج کی مانند تھا دل میں لیکن
اَب سمندر کی طرح پھیل گیا سنّاٹا

کس نے آکر دیا احساس یہ سرگوشی کی
جاگ اُٹھی خلوتِ دل چونک پڑا سنّاٹا

میں وہ سقراط ہوں میخانۂ تنہائی کا
جو کہ پیتا ہے فقط زہر بھرا سنّاٹا

رگِ احساس میں رہ رہ گئے ہیں چُبھتی کرچیں
دِل میں شیشے کی طرح ٹوٹ گیا سنّاٹا

عصرِ حاضر کا وہ جنگل ہو کہ دشتِ ماضی
سانپ بن کر مجھے ڈستا ہی رہا سنّاٹا

جس قدر کیف مرے دل میں بڑھے ہنگامے
خلوتِ ذہن میں اُتنا ہی بڑھا سنّاٹا

یہ شورِ زندگی یہ رُوح کا گمبھیر سنّاٹا
بنا جاتا ہے ہر انسان کی تقدیر سنّاٹا
یہ تنہائی کسی صورت مرا پیچھا نہ چھوڑے گی
بھری محفل میں بھی رہتا ہے دامن گیر سنّاٹا
جسے دیکھو وہی قیدی ہے زندانِ تخیّل کا
سبھی کے ذہن میں ہے صورتِ زنجیر سنّاٹا
ہزاروں انقلابات آئیں اس دُنیائے فانی میں
مگر کم ہو نہیں سکتا یہ عالمگیر سنّاٹا
طبیعت کو جو بہلانا ہے تنہائی میں بہلاؤ
سکونِ دل کی خاطر ہے بہت اکسیر سنّاٹا
تم اک شہزادیِ عشرت میں شہرِ غم کا شہزادہ
تمھاری سلطنت محفل، مری جاگیر سنّاٹا
زبانِ دشت کو اب تک کوئی سمجھا نہیں لیکن
لبِ خاموش سے کرتا رہا تقریر سنّاٹا
نظر آتے ہیں دشتِ دل میں جب اُمّید کے طائر
چلا دیتا ہے کچھ ویرانیوں کے تیر سنّاٹا
چلو اے کیف مُدّت سے تمھیں آواز دیتا ہے
برائے شعر گوئی شام کا گمبھیر سنّاٹا

بستی بستی سونا پن ہے نگر نگر سنّاٹا ہے
جب سے دل ویران ہوا تا حدِ نظر سنّاٹا ہے

ہر کروٹ جذباتِ الم کی بن جاتی ہے ایک تھکن سی
رات کو شورِ آہ و فغاں تھا پچھلے پہر سنّاٹا ہے

جب سے لُٹی ہے انجمنِ دل کیا تنہائی کیسی محفل
ذہن میں لاکھوں ہنگامے ہیں دل میں مگر سنّاٹا ہے

سُنتے ہیں اے گردشِ دوراں دشت بھی ہیں اب شہرِ بداماں
لیکن اپنی دُنیا میں تو شام و سحر سنّاٹا ہے

کیفؔ کسی سے کیا ہو شکایت توڑ دیا خود ساز محبت
حسُن کے گھر شہنائی کے نغمے عشق کے گھر سنّاٹا ہے

○

سُورج کی دُھوپ برف سی تحلیل ہوگئی
صحرا کی ریت پیاس کی اِک جھیل ہوگئی

کلیوں کے دِل میں صرف اندھیروں کا زہر تھا
خوشبو تڑپ کے درد کی قندیل ہوگئی

پلکوں پہ چند سائے لرزتے رہے مگر
آنکھوں میں بزمِ خواب کی تشکیل ہوگئی

پانی کی پیاس پی کے بھی میں تشنہ لب رہا
ہر موجِ آب آگ میں تبدیل ہوگئی

قاری نے غور و فکر میں جب ڈوب کر پڑھا
خود ہی کلامِ کیفؔ کی ترسیل ہوگئی

ہاتھ پیلے کر کے وہ خود بھی تو پیلی ہو گئی
حادثوں کا زہر پی کر رُوح نیلی ہو گئی

کتنے لمحے کھو گئے آوارگی کے دشت میں
جب بھی غفلت میں گرفتِ وقت ڈھیلی ہو گئی

اپنے کمرے سے ذرا باہر نکل کر دیکھئے
اب زمانہ کی فضا کِتنی نشیلی ہو گئی

دشتِ غم کی چلچلاتی دُھوپ کے بھی جسم سے
اِس قدر نکِلا پسینہ ریت گیلی ہو گئی

خونِ دل، خونِ تمنّا، خونِ احساسات سے
کیف تیری شاعری کِتنی رنگیلی ہو گئی

○

جب سے میری رازداں تیری سہیلی ہو گئی
اور بھی میرے لئے تو اک پہیلی ہو گئی

غالباً وہ پھول سا چہرہ کہیں مُرجھا گیا
مضمحل کیوں میرے آنگن کی چمیلی ہو گئی

اب مری تنہائی بھی رہتی نہیں میرے قریب
ہائے میری زندگی کتنی اکیلی ہو گئی

اَب کسی کی یاد کے آسیب بھی رہتے نہیں
کس قدر ویران یہ دِل کی حویلی ہو گئی

آپ بھی اشعار میں ابہام پیدا کیجئے
کیف صاحب شاعری اب اک پہیلی ہو گئی

وقت کی نیلگوں رگوں میں جب خونِ ماضی سفید ہوتا ہے
دامنِ بیکسی میں مستقبل اپنا چہرہ چھپا کے روتا ہے

آج کے عہد کا ہر ایک بشر اپنے دُکھتے نحیف شانوں پر
چند لمحوں کی زندگی میں بھی کتنی صدیوں کا بوجھ ڈھوتا ہے

کاش تیرا خیال ہی آ کر ٹھوکروں سے اُسے جگا دیتا
مدّتوں سے جو میری آنکھوں میں ایک رنگین خواب سوتا ہے

میری آنکھیں بکھیر کر آنسو غم کے اِمرت سے سینچ دیتی ہیں
جب ترا درد دِل کی رگ رگ میں نامُرادی کا زہر بوتا ہے

تب کہیں جا کے کیف ایک غزل پیکرِ شاعری میں ڈھلتی ہے
دردِ تخلیق سے تڑپ کر جب مدّتوں دِل کا خون ہوتا ہے

○

وہ کڑی دُھوپ ہے کہ ہر ذرہ شدّتِ تشنگی سے تُھنتا ہے
پھر بھی دشتِ حیات میں کوئی تیری یادوں کے پھول چُنتا ہے

پھر کسی کے خیال کا سورج اُفقِ ذہن سے طلوع ہوا
پھر مرا دِل حسین خوابوں کی سُرخ کرنوں کے جال بُنتا ہے

یہ مشینوں کا شہر ہے اے دِل بات کرنی بھی ہے یہاں مشکل
ایسے ہنگامہ خیز عالم میں تیری آواز کون سُنتا ہے

وقت کا ناگ پھن اُٹھائے ہوئے ڈس رہا ہے معاشرے کو مگر
ہر بشر اپنے دِل کی دھڑکن پر جانے کس دُھن میں سر کو دُھنتا ہے

دِل میں کرتا ہے اعتراف مگر ظاہرہ دادِ فن نہیں دیتا
کیفؔ جب تیرے حاسدوں میں کوئی تیری غزلوں کے شعر سُنتا ہے

○

آتشِ گُل میں بہم سُلگتی ہوئی نکہتِ مضطرب آہ بھرتی رہی
اور موجِ نسیمِ سحر فطرتاً شعلۂ رنگ سے چھیڑ کرتی رہی

گو تری چلچلاتی ہوئی دُھوپ میں میرے احساس کا پھول مُرجھا گیا
لیکن اے آفتابِ غمِ زندگی تیرے چہرے کی رنگت اُترتی رہی

اہلِ بزمِ جہاں گو ہر اک گام پر آرزوؤں کی بیڑی پہناتے رہے
پھر بھی مجبور رقاصۂ زندگی آخری سانس تک رقص کرتی رہی

اپنے قدموں کی آواز سے چونکتا جیسے شہرِ خموشاں سے گذرے کوئی
آج کی رات یوں دل کے شمشان میں تیری یاد اپنی آہٹ سے ڈرتی رہی

کیف میرے تخیّل کی رعنائیاں ذہن کی سطح سے مٹ گئیں تھیں مگر
جانے کس کے خیالوں کی قوسِ قزح میرے اشعار میں رنگ بھرتی رہی

○

میرے دشتِ ذہن میں منتشر یہ ترے خیال کی دُھول ہے
کہ دیارِ کفر و گناہ میں تری رحمتوں کا نزُول ہے

تیرے عارضوں سے جھلک رہی ہیں کلامِ پاک کی آیتیں
تیرے عارضوں کو بھی چُومنا مری بندگی کا اصُول ہے

ترے غم کی آبِ بقا سے بھی مرے دِل کی پیاس نہ بجُھ سکی
جو خود اپنی آگ میں جل گیا یہ وہی گلاب کا پھُول ہے

کبھی ہر قدم پہ لُٹائے گی یہی تجربات کی چاندنی
مرے ساتھ راہِ حیات میں یہ جو حادثات کی دُھول ہے

یہ غزل ہے یا کوئی معجزہ یہ ہے شاعری کہ پیمبری
کوئی کیفؔ کو نہ سمجھ سکا کہ وہ اپنے فن کا رسول ہے

○

وہ نگارِ چمن جو گلشن میں زیرِ لب مسکرا کے شرمائے
نکہتِ گل کی رُوح جاگ اُٹھے اور رنگوں میں جان پڑ جائے

میں وہ غالب کا شعر ہوں جسکو آج تک کوئی بھی سمجھ نہ سکا
اور تم میر کی اک ایسی غزل جو ہر اک اہلِ دل کو تڑپائے

خواب خود ہو رہے ہیں خوابیدہ نیند کو نیند آئی جاتی ہے
جاگتی رات کے شبستاں میں کون آیا ہے زُلف بکھرائے

میری آنکھوں سے گِر کے ہر آنسو یوں چمکتا ہے شامِ غم اکثر
جیسے وقتِ شکست بھی تارا روشنی کی لکیر بن جائے

اُف وہ جذبات جو مرے دل میں کیف تحلیل ہو گئے تھے کبھی
میرے احساس کے سمندر میں بار ہا لہر بن کے لہرائے

○

زندگی زہر بھی امرت سے بھری پیالی بھی
بادۂ عیش سے لبریز بھی ہے خالی بھی

میں نے اشکوں سے کبھی خون کی ہولی کھیلی
اور اشکوں سے منائی کبھی دیوالی بھی

دیوتا روٹھ کے گم ہو گئے کیا جانے کہاں
اور ٹھکرا گئے پھولوں سے بھری تھالی بھی

موسمِ گل پہ مرا حق بھی ہے گلشن والو
سرخیٔ گل میں مرے خون کی ہے لالی بھی

عشق کی راہ میں اے کیفؔ سنبھل کر چلنا
یہ جوانی ہے خرد مند بھی متوالی بھی

○

ہر ظلم، ہر ستم ہے غزالوں کے شہر میں
چاہت کہاں ہے چاہنے والوں کے شہر میں

اے رشکِ مہر و ماہ تمھیں کچھ خبر بھی ہے
اک تیرہ بخت بھی ہے اُجالوں کے شہر میں

پھر بھی غمِ حیات کی ظلمت نہ مِٹ سکی
برسوں پھرا ہوں زہرہ جمالوں کے شہر میں

جب سے سُنی ہے آمدِ محبوب کی خبر
آنکھیں بچھا رہا ہوں خیالوں کے شہر میں

اے کیفؔ تیرے شعر ہیں یا پیکرِ جمال
شاید غزل لکھی ہے غزالوں کے شہر میں

○

آتشِ محبت میں یوں شباب جلتا ہے
اپنی آگ میں جیسے آفتاب جلتا ہے

آسمان کے تارے۔ سرد سرد انگارے
چاندنی کے پہلو میں ماہتاب جلتا ہے

کیسی آگ بھڑکائی موسمِ بہاراں نے
ہر کلی سلگتی ہے، ہر گلاب جلتا ہے

آنسوؤں سے بھیگی ہے میری ہر پلک لیکن
پھر بھی میری آنکھوں میں شہرِ خواب جلتا ہے

وہ نقابِ گُل ہو یا پردۂ رخِ حسین
کیف حُسن کی لَو میں ہر حجاب جلتا ہے

○

میرے فقیرِ دل کی جبیں بد دعا ملے
شہرِ طرب میں رہ کے بھی وہ غمزدہ ملے

اوراقِ یادداشت پلٹ کر تو دیکھئے
شاید کسی ورق پہ مرا تذکرہ ملے

یوں تیرے غم نے مجھکو گرفتار کر لیا
جیسے بغیر جرم کسی کو سزا ملے

وہ درد ہو کہ اشکِ مسرت ہو یا الم
مجھ کو تو راہِ عشق میں سب بے وفا ملے

تم خواب میں بھی آؤ اگر بھول کر کبھی
بیمارِ انتظار تمھیں جاگتا ملے

اے ناقدانِ وقت ذرا غور سے پڑھو
شاید کلامِ کیف میں کچھ فلسفہ ملے

○

یوں سُلگتا ہے دِل آتشِ صبر میں
جیسے برقِ تپاں دامنِ ابر میں

کاش ہم تم نہ بچھڑیں پسِ مرگ بھی
مَر کے بھی دفن ہوں ایک ہی قبر میں

زندگی ایک بیوہ دُلہن کی طرح
آہ بھرتی رہی حجلۂ صَبر میں

آنسوؤ! صبح تک یوں ہی روشن رہو
چاند کا کیا بھروسہ شبِ اَبر میں

یوں مُجھے شعلۂ عِشق سے پیار ہے
جیسے آتش کی عظمت دلِ گبر میں

چند زندہ خیالات بھی دفن ہیں
کیفؔ دیکھو ذرا ذہن کی قبر میں

○

اب مری ہر چشمِ تر شعلے نہ برسائے کہیں
دامنِ ضبطِ محبت بھی نہ جل جائے کہیں

ہر طرف پھیلا ہوا ہے تیری یادوں کا دھواں
چند سانسیں لے کے میرا دم نہ گھٹ جائے کہیں

جا رہی ہے وہ صبا بھر لاشۂ خوشبو لیے
مرگِ گل پر فصلِ گل کا دل نہ بھر آئے کہیں

برف بن کر منجمد ہے آج دردِ دل مگر
کل پگھل کر آگ کا دریا نہ بن جائے کہیں

شعلہ زارِ عشق کی اِس چلچلاتی دھوپ میں
خاک ہو جائیں نہ تیرے غم کے بھی سائے کہیں

تیرے غم کے بادلوں میں میرے دل کا آفتاب
زندگی کی دوپہر ہی میں نہ ڈھل جائے کہیں

کاش وہ جانِ غزل بن کے عروسِ فکر و فن
کیف میرے شعر کے گھونگھٹ میں شرمائے کہیں

○

وقت کی شاخ پہ مرجھا گئے لمحات کے پھول
دل میں تازہ ہیں مگر تیری ملاقات کے پھول

گلشنِ دل سے جو گذری تری یادوں کی صبا
شاخ در شاخ کھلے تیرے خیالات کے پھول

اب کہاں دل میں وہ آغازِ محبت کی بہار
وقت کی دھوپ میں کمھلا گئے جذبات کے پھول

دشتِ دل پیار کی خوشبو سے مہک جاتا ہے
جب بھی لاتی ہے صبا تیرے پیامات کے پھول

تیری آنکھوں میں مہکتی ہیں غزل کی کلیاں
تیرے ہونٹوں سے برستے ہیں حکایات کے پھول

آج یوں غرق ہیں اشکوں میں مرے زخمِ جگر
جیسے دریا میں ہمکتے ہوئے برسات کے پھول

شام غم کانپ اٹھی، شمع کی لَو تھرّائی
مرقدِ صبح میں جب دفن ہوئے رات کے پھول

عہدِ حاضر کے دہکتے ہوئے انگاروں پر
خاک ہو جائیں گے فرسودہ روایات کے پھول

شعر گوئی سے اگر کیفِ عقیدت ہے تجھے
فن کی دیوی پہ چڑھا تازہ خیالات کے پھول

◯

سرِ گلشن چھڑے جب بھی ترے گیسو کے افسانے
لبِ گُل میں تڑپ کر رہ گئے خوشبو کے افسانے

طلسمِ خواب مستقبل بھی اکثر توڑ دیتے ہیں
تری آنکھوں کے سوتے جاگتے جادُو کے افسانے

ابھی تک گونجتے ہیں میری یادوں کے شبستاں میں
تری پازیب کے نغمے ترے گھنگھرو کے افسانے

نسیمِ صبح بھی اکثر گذر جاتی ہے کترا کر
کوئی سُنتا نہیں بے تابیٔ خوشبو کے افسانے

خدا کے واسطے تم روک لو اپنے تبسُّم کو
کہیں رُسوا نہ ہو جائیں مرے آنسو کے افسانے

حقائق کی کڑی راہوں میں گیسو کھول دیتے ہیں
کسی گُلنار کے قصّے، کسی مہ رُو کے افسانے

یہ رومانی غزل اے کیفؔ عکسِ حسنِ خوباں ہے
سبھی اشعار ہیں شہرِ لب و گیسو کے افسانے

○

جب بھی آنگن میں وہ گلریز جوانی مہکی
چاند گلبار ہوا، رات کی رانی مہکی

شہر در شہر مرے پیار کے قصے پہنچے
صورتِ نکہتِ گلُ دل کی کہانی مہکی

پھر مرے ذہن میں یادوں کے حسیں پھول کھلے
پھر خیالوں میں خیالات کی رانی مہکی

گلشنِ دل میں جو خنداں ہوئے زخموں کے گلاب
چشمِ نمناک میں اشکوں کی روانی مہکی

لاکھ سمجھایا نسیمِ سحری نے لیکن
پھر بھی نادان کلی بات نہ مانی، مہکی

حُسن ہر رنگ میں آزاد رہا کرتا ہے
قید میں رہ کے بھی کلیوں کی جوانی مہکی

زلف و رخسار کا جب ذکر ہوا شعروں میں
کیفؔ کچھ اور تری طرزِ بیانی مہکی

عارض و زلف کی خوشبو سے معطر یادیں
گلشنِ دل میں کھلیں مثلِ گُلِ تر یادیں

پہلے رخسار کے پھولوں کیطرح نازک تھیں
اب ترے دل کی طرح بن گئیں پتھر یادیں

درِ ماضی پہ کسی درد کی دستک سُن کر
کھول دیتی ہیں خیالات کا دفتر یادیں

جب مرے سر پہ چمکتا ہے دُکھوں کا سُورج
تان دیتی ہیں ترے پیار کی چادر یادیں

شدّتِ درد سے جب ذہن تڑپ اُٹھتا ہے
دابتی ہیں بڑے نازوں سے مرا سر یادیں

دلِ بیتاب کو دیتی ہیں تسلّی پہروں
کون کہتا ہے کہ ہوتی ہیں ستمگر یادیں

وہی انداز وہی شکل وہی ناز و ادا
بن گئیں جیسے مجسّم ترا پیکر یادیں

دِل کو دیتی ہیں محبت کے خدا کا پیغام
مذہبِ عشق کی گویا ہیں پیمبر یادیں

یہ وہی شہرِ طلسمات ہے یا شہرِ جنوں
مجھکو آخر کہاں لے آئیں فسوں گر یادیں

اُف وہ آغازِ محبّت کے سنہرے لمحے
ہائے وہ عہدِ گزشتہ کی منوّر یادیں

جب بھی گذرے ہوئے لمحات کا خیال آتا ہے
خوب روتی ہیں مرے دل سے لپٹ کر یادیں

اِک طرف زخم میں بھرتا رہا غم کا مرہم
اِک طرف دِل میں چبھوتی رہیں نشتر یادیں

اب کہاں تیرے خیالوں سے مرے دل کو مفر
بن گئیں جیسے مرے دل کا مقدّر یادیں

جب زمانہ میں کہیں ان کا ٹھکانہ ہی نہیں
کِس طرح جائیں مِرے دِل سے نکل کر یادیں

جس کے دیدار کی طاقت مری آنکھوں میں نہیں
آئینہ بن کے دکھاتی ہیں وہ منظر یادیں

کیفؔ ہر فکرِ سخن شعر میں ڈھل جاتی ہے
جب مرے ذہن میں ہوتی ہیں سخنور یادیں

O

صبح تک ہر ستارہ تڑپتا رہا نبضِ حالات کروٹ بدلتی رہی
تیری فرقت میں اے رشکِ ماہِ مُبیں چاندنی رات کروٹ بدلتی رہی

تیرے غم کی دہکتی ہوئی دُھوپ میں آرزوؤں کی کلیاں سلگتی رہیں
تیری یادوں کی تپتی ہوئی ریت پر روحِ جذبات کروٹ بدلتی رہی

اپنے آئینۂ عہدِ ماضی میں ہم تیرے گیسوئے برہم ہی دیکھا کئے
اور دوشیزۂ وقت کے دوش پر زلفِ لمحات کروٹ بدلتی رہی

تیری بزمِ محبت میں ہر اہلِ دل اپنا افسانۂ غم سُنا بھی گیا
اور میرے لرزتے ہوئے ہونٹ پر دل کی ہر بات کروٹ بدلتی رہی

تجھ کو معلوم بھی ہے کچھ اے گُلبدن ایک مجبور کی غمزدہ زندگی
تیری فرقت میں کانٹوں بھری سیج پر بعض اوقات کروٹ بدلتی رہی

جس ملاقات کے بعد ہم رات دن تیری یادوں کے پہلو میں تڑپا کئے
میرے ذہن و خیالات میں آج تک وہ ملاقات کروٹ بدلتی رہی

کیفؔ میرے حوادث زدہ ذہن میں سوچنے کی بھی قوت نہیں ہے مگر
پھر بھی میری غزل کے ہر اک شعر میں اک نئی بات کروٹ بدلتی رہی

دل میں جو سوز ہے وہ کسی پر عیاں نہیں
یہ وہ سُلگتی آگ ہے جس میں دھواں نہیں

پیراہن حیات میں لاکھوں ہیں سِلوٹیں
لیکن کسی جگہ بھی شِکن کا گماں نہیں

یہ ساعتِ نمازِ محبت ہے زاہدو
دھڑکن ہے میرے دل کی، صدائے اذاں نہیں

کرتا ہوں میں تلاوتِ قرآنِ زندگی
آوازِ بندگی ہے یہ شورِ فغاں نہیں

اے زلفِ یار جو مرے دل کو نصیب ہیں
تیری تڑپ میں بھی وہ پریشانیاں نہیں

ہر دَور میں کِھلا ہوں محبت کی شاخ پر
میں غنچۂ بہار ہوں برگِ خزاں نہیں

اے کیفؔ! دُور تک ہیں ترے فن کی شہرتیں
کیا غم جو گھر میں کوئی ترا قدرداں نہیں

گلوں کو موت کی نیند آ گئی ہے
مگر خوشبو ابھی تک جاگتی ہے

ترے غمگیں لبوں پر یوں ہنسی ہے
کہ جیسے دن میں بکھری چاندنی ہے

متاعِ غم بھی شاید کھو گئی ہے
اُداسی سر برہنہ پھر رہی ہے

ہر اک رُخ پر ہے یوں گردِ تفکّر
کہ جیسے ساری دُنیا فلسفی ہے

مرا دِل موجِ طوفانِ تمنّا
محبّت ایک سنجیدہ ندی ہے

میں وہ مجبورِ غم ہوں جس نے اکثر
ہنسی بھی آنسوؤں کیساتھ پی ہے

نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا زمانہ
محبّت موت ہے یا زندگی ہے

مری آواز پر جب تم نہ آئے
تو خود آواز نے آواز دی ہے

کسی کی یاد بھی ہے بارِ خاطر
محبّت کتنی نازک ہو گئی ہے

بظاہر شبنم آلودہ ہیں کلیاں
مگر رگ رگ میں اک آتش بھری ہے

شمیمِ گُل کی رسوائی کا باعث
نسیمِ صبح کی آوارگی ہے

یہ شب جیسے کوئی معصوم بچّی
ستاروں کے کھلونے کھیلتی ہے

تری فرقت میں اَے جانِ تغزُّل
مری ہر اک غزل کتنی دُکھی ہے

مرا ہر شعر تابندہ ہے جس سے
وہ میرے تجربوں کی چاندنی ہے

جسے اَے کیفؔ کچھ ہی لوگ سمجھے
وہی تو شعر رُوحِ شاعری ہے

یہ کس کی یاد خراماں ہوئی صبا کی طرح
مہک رہا ہے ہر اک زخم دِل حِنا کی طرح

ہر ایک آہ لرزتی ہے میرے ہونٹوں پر
کسی غریب کی سہمی ہوئی دُعا کی طرح

مریضِ عشق کو مرہم کی بھی نہیں حاجت
کہ خون زخم پہ خود جم گیا دوا کی طرح

اک آگ سی مرے احساس میں بھڑکتی ہے
ترا خیال گذرتا ہے جب ہوا کی طرح

کسی کے دَر پہ محبّت کی بھیک بھی نہ ملی
تمام عمر میں پھرتا رہا گدا کی طرح

کسی چمن میں بھی وہ گُل نظر نہیں آیا
چمن چمن میں بھٹکتا رہا صبا کی طرح

چلے بھی آؤ کہ معراجِ عشق ہو جائے
کہ آج رات اکیلا ہوں میں خدا کی طرح

جنابِ کیفؔ کا ہر شعر بزمِ عالم میں
اُبھر رہا ہے تڑپتی ہوئی صدا کی طرح

○

پھولوں کی طرح حسن کو رسوا نہیں کرتے
یہ زخمِ جگر کھل کے بھی مہکا نہیں کرتے

سورج کی طرح ڈوب رہا ہوں میں اکیلا
سائے بھی مرا ساتھ گوارا نہیں کرتے

یہ درد کا مہتاب یہ اشکوں کے ستارے
ڈھل کر بھی چمکتے ہیں اندھیرا نہیں کرتے

اے حشر! جنھیں خوابِ محبت کا ہے نشّہ
وہ صور کی آواز سے جاگا نہیں کرتے

دل ہے کہ سلگتی ہوئی موجوں کا سمندر
بادل بھی برس کر جسے ٹھنڈا نہیں کرتے

خوابوں کے فسوں کار جزیروں کے مسافر
ہر شہرِ طلسمات میں ٹھہرا نہیں کرتے

اے کیف کچھ ایسے بھی ہیں جذبے مرے دل میں
جو شعر کے پیکر میں سمایا نہیں کرتے

کوئی سمجھ نہ سکا میری گفتگو کیا ہے
غریبِ شہرِ محبت کی آرزو کیا ہے

ہر آدمی کو سرِ دشتِ خود فراموشی
تلاشِ خود کے سوا اور جستجو کیا ہے

ذرا پلٹ کے تو دیکھو صحیفۂ ماضی
مری حیاتِ گذشتہ کی آبرو کیا ہے

نسیم! چاکِ گریبانِ گُل پہ طنز نہ کر
کلی سے پوچھ کہ کیفیتِ نمو کیا ہے

سکوتِ شب کے سوا کوئی بھی سمجھ نہ سکا
چراغِ صبح کی خاموش گفتگو کیا ہے

میں ایک اُچٹی ہوئی نیند ہوں جوانی کی
شکستِ خوابِ محبت ہے اور تُو کیا ہے

ہر ایک بات پہ رہ رہ کے چیخنے والو
مرے لبوں سے بھی پوچھو کہ گفتگو کیا ہے

ہر ایک شعر تم اے کیفؔ خونِ دل سے لکھو
جو فن کے کام نہ آئے تو پھر لہو کیا ہے

اللہ رے یہ سوزِ محبّت کا بانکپن
اک جوُئے دردِ دل کی رگوں میں ہے موجزن

دل میں کسی کے پیار کا لاشہ لئے ہوئے
میں سی رہا ہوں اپنی تمنّاؤں کا کفن

یوں قلبِ خوں شُدہ میں ہے لرزاں کسی کی یاد
جیسے لباسِ سُرخ میں سہمی ہوئی دُلہن

میں جس کی جستجو میں صبا کی طرح پھرا
رہتا ہے دُور دُور وہی مجھ سے گلبدن

اُف دشتِ غم میں یہ تری یادوں کی نکہتیں
محسوس ہو رہی ہے مجھے ہر نفس گھُٹن

اَے کیف دورِ نو کا مسیحِ سخن ہوں میں
گردن میں ڈال دی ہے کسی نے صلیبِ فن

○

ہوئے ہم نہ دِل شکستہ غمِ کائنات سہ کے
کبھی درد بن کے چمکے کبھی زخم بن کے مہکے

تری قربتوں سے جس نے مجھے دُور کر دیا تھا
ترے پاس مجھ کو لائی وہی موجِ درد بہکے

مرا دِل ہی اشکِ شبنم، مرا دِل ہی آتشِ گُل
کبھی برف بن کے پگھلے کبھی آگ بن کے دہکے

تری یاد کی مہک سے ہوا ہر نفس معطّر
ترے غم سے عِطر لے کر مرے دِل کے داغ مہکے

تو وہ بد نصیب غنچہ جو کِھلا نہ فصلِ گُل میں
میں وہ سبزۂ چمن ہوں جو خزاں میں اور لہکے

کبھی کیف گُل رخوں میں ہوئے نغمہ ریز یوں بھی
کسی بزمِ گُل میں جیسے کوئی عندلیب چہکے

جب بھی خوابوں کے کسی موڑ سے ہم گذرے ہیں
ٹھوکریں کھا کے بہت تیز قدم گذرے ہیں

یوں حقائق کی کڑی دھوپ سے ہم گذرے ہیں
جیسے دوزخ سے فرشتوں کے قدم گذرے ہیں

شامِ تاریک میں جیسے کسی جنگل کا سفر
یوں زمانے کے بیابان سے ہم گذرے ہیں

ہر نفس مجھ کو یہ محسوس ہوا ہے جیسے
اِک جنم ہی میں مجھے لاکھ جنم گذرے ہیں

آج پتّھر کی طرح ساکت و جامد ہیں تو کیا
خون بن کر بھی رگِ سنگ سے ہم گذرے ہیں

قرض کا بوجھ لئے دکھتے ہوئے شانوں پر
شہر در شہر ترے کشتۂ غم گذرے ہیں

تیرہ بختی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا لیکن
روشنی بن کے تری راہ سے ہم گذرے ہیں

وہم و تشکیک کی آسیب زدہ راہ سے ہم
تھک گئے ہیں تو بہت تیز قدم گذرے ہیں

کیفؔ نقاد کا معصوم قلم کیا جانے
دشتِ تخلیق سے جس حال میں ہم گذرے ہیں

○

حسن کے عشرت کدہ میں عشق کا ماتم ہوا
کل جو تھا شہرِ مسرت آج شہرِ غم ہوا

اب وفورِ غم میں یہ احساس بھی مجھکو نہیں
دردِ دل کچھ بڑھ گیا یا دردِ دل کچھ کم ہوا

وہ یقیناً رو رہے ہیں آج میری یاد میں
دفعتہً کیوں میرا دامانِ تصوّر نم ہوا

میرا ہر اک اشک اک پانی کا قطرہ تھا مگر
خونِ دل کا رنگ پا کر شاہکارِ غم ہوا

میرے نالے سن کے دنیا خوابِ غفلت سے اٹھی
میرا رونا باعثِ بیداریٔ عالم ہوا

صرف شبنم ہی نہیں صحنِ چمن میں غمزدہ
خندۂ گل سے بھی اکثر انکشافِ غم ہوا

کیفؔ تیری ہر غزل ہے آیتِ قرآنِ دل
تیرا ہر اک شعر پیغامِ خدائے غم ہوا

ہم بھی پریشاں تم بھی پریشاں کوئی کسی کے کام نہ آئے
جو بادل خود ہی پیاسا ہو دھرتی کی کیا پیاس بجھائے
کب تک کوئی دِل کی لگی کو جلتے ہوئے اشکوں سے بجھائے
تن کی چاندی، من کا سونا آتشِ غم میں پگھلا جائے

آج کی شب یوں دل کے کھنڈر میں یادوں کے جگنو چمکے ہیں
جیسے کوئی تاریک مکاں میں دیوالی کا جشن منائے

جانے کیا کیا سوچ رہا ہے جانے کس کو کھوج رہا ہے
تنہائی کی شاخ پہ بیٹھا مَن کا پنچھی پَر پھیلائے

یوں دِل کے پُر خواب دریچوں پر کوئی دستک دیتا ہے
جیسے کوئی نیند میں آکر سپنوں کا سنگیت سنائے

پیاسی پیاسی دِل کی اُمنگیں، بپھری بپھری درد کی موجیں
چڑھتی جوانی پریم دوانی لہر لہر ندیا لہرائے

کیفؔ ترے اشعار ہیں یا لَو دیتے ہوئے انگارے ہیں
تیری غزل کی آگ میں جل کر کتنے گلابی لب مرجھائے

اشکوں میں بھی ڈوب کے اکثر یوں میرا من سُلگے ہے
جیسے بھری برسات میں خود ہی چندن کا بدن سُلگے ہے

ڈرتا ہوں غم کے شعلوں سے رُوح بھی خاک نہ ہو جائے
پہلے مَن ہی سُلگ رہا تھا اب سارا تن سُلگے ہے

یہ وہ آگ نہیں جو تھوڑی دیر بھڑک کر بجھ جائے
پیار کی آگ میں جلنے والا سارا جیون سُلگے ہے

جو تیری قربت کی خوشبو سے برسوں شاداب رہا
آج تری فرقت کے شعلوں سے وہ آنگن سُلگے ہے

جیسے چمن میں آتشِ گُل سے کوئی لباسِ گل جلتا ہو
شعلۂ جسم سے اکثر تیرا یوں پیراہن سُلگے ہے

اِک دن اس نے چوم لیا تھا تیرے دہکتے عارض کو
تب سے نسیمِ آوارہ بھی گلشن گلشن سُلگے ہے

تب جا کر الفاظ کے پیکر میں ڈھلتی ہے ایک غزل
پہروں ذہن کی بھٹی میں جب کیفؔ مرا فن سُلگے ہے